ڈاکٹر صدف فاطمہ

استاد شعبہ اردو، محمد علی جناح یو نیورسٹی، کراچی

سرشار صدیقی اور قومی شاعری

Dr. Sadaf Fatima

Assistant Professor, Urdu Department,

Muhammad Ali Jinnah University, Karachi.

Sarshar Siddiqui, National Poetry, Urdu

Sarshar Sidiqui is such a name of our literaturewho does not need to be introduced. He is recognized himself by his different style. He is habitual of speaking straight straight-forward.He indicates life's bitterness, realities, social and economic injustices. In literature to write truth in a true manner, courage and boldness is necessary and Sarshar Siddiqui has such qualities at large scale.

After study of Sarshar Siddiqui's national poetry it can be assumed easily that he loves his country so much. If he is called a true and sincere Pakistani, it will not be improper and inaccurate. He is full of partriotism. This book does not express only emotions of patriotism but this book also represents emotions of muslim people and circumstances as well as.

سرشار صدیقی ہمارے ادب کا ایک ایسا نام ہے جسے کسی تعارف کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے تیکھے اور منفرد انداز سے خود پہچان لیے جاتے ہیں۔ وہ دوٹوک بات کرنے کے عادی ہیں۔ وہ زندگی کی تلخیوں، حقائق، معاشرتی اور معاشی ناانصافیوں کی طرف واضح اشارے کرتے ہیں۔ ادب میں سچی بات سچے انداز میں کہنے کے لیے ہمت و جرات کی ضرورت ہوتی ہے جو سرشار کے ہاں بدرجہ اتم موجود ہے۔[1]

ان کی شعر گوئی کا ایک مخصوص لب ولہجہ ہے۔اس لہجے کو کوئی نام دینا چاہیں تو رجائی لب ولہجہ کہہ سکتے ہیں۔اس رجائی لب ولہجہ پر اخلاق و جرات کی چھاپ بہت گہری ہے۔اس لیئے اسے بے باک اور اور جرات مندانہ لب ولہجہ بھی کہہ سکتے ہیں۔[۲]

سرشار صدیقی کی زندگی پر مولانا حسرت موہانی کا بڑا واضح اثر نظر آتا ہے۔ ہر چند کہ انہوں نے مولانا سے براہ راست کسب فیض نہیں کیا تاہم ایک شہر کے باسی ہونے کے ناتے مولانا کی عظیم الشان شخصیت کا پرتو کانپور کے ہر چھوٹے بڑے شخص پر بقدر ظرف ضرور پڑا ہے۔ چنانچہ سرشار بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ وہ شروع میں اشتراکی بنے پھر ترقی پسند ادیب و شاعر اور صحافی مختلف ادبی انجمنوں کی سرپرستی اور وابستگی کے علاوہ اردو زبان وادب کی ترقی کے لیے ہمہ وقت سرگرداں رہتے ہیں۔اور اب وہ روحانی انقلاب بھی معنوی طور پر حسرت کا ہی فیض ہے۔[۳]

سرشار رومانی شاعر نہیں ہیں ان کی شاعری پر اعتبار کرنے کے لیے اتنی ہی بات کافی ہے نہ تو وہ محبوب کی آنکھوں کا فلسفی ہے اور نہ چاندنی راتوں کا۔ یہ درست ہے کہ اسے محبوب بہت اچھا لگتا ہے۔ چاندنی راتیں بھی اسے بے حد پسند ہیں۔آدھی رات کو نرم ہوا کی سرگوشیاں بھی سنتا ہے۔اور درختوں کے شام کے گہرے سایوں سے بھی لطف اندوز ہوتا ہے۔لیکن یہ سب باتیں اس کی زندگی کا حسن بھی ہیں جس میں بے شمار تلخیاں بھی ہیں۔شہروں سے سفر کرتا ہوا مکرو فریب کا سیلاب چھوٹی چھوٹی بستیوں تک پہنچ گیا ہے۔مکروفریب سازش و عادت کے نئے قافلے دنیا جہاں سے ہمارے شہروں میں مسلسل برآمد ہو رہے ہیں۔سرشار کی شخصیت اس شہر میں زندگی گزارتے ہوئے رومان پرست ہو ہی نہیں سکتی۔اس کے لہجے کے امکانات بھی ابتدا ہی سے کچھ اور رہے ہیں۔ وہ ہمیشہ زندگی کے تضادات کے سامنے اپنی بھرپور قوت کو آزمانا چاہتا ہے۔[۴]

سرشار صدیقی بنیادی طور پر جبلتوں کی تنظیم نو کا شاعر ہے۔ وہ روح کی لطافتوں کے پہلو بہ پہلو بدن کی حقیقت کے بھی پوری طرح قائل ہیں۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ بحیثیت شاعر اسے اپنے بدن کے تقاضوں سے ابھرنے والے جذبوں کو قبول کرنے کے ساتھ ساتھ ان سے بے تعلق رہنا بھی ضروری ہے۔اس طرح وہ اپنے جذبات کا محکوم بھی ہے اور اس سے آزاد بھی۔ جذبات سے محکومی اور ان سے آزادی کی کشاکشی ایک ایسا بار امانت ہے جسے ایک سچا فن کار ہی برداشت کر سکتا ہے۔سرشار کی شاعری اس بار امانت کو اپنی زندگی کا سرمایہ اور ایک بڑی حد تک اپنی ذات کی شناخت بنانے ہی کا نتیجہ نظر آتی ہے۔فرائڈ کے نزدیک فن کے ذریعے جبلتیں ارتقا پاتی ہیں۔اور فن کار وہ تسکین جو اسے زندگی میں حاصل نہیں ہوتی اپنے

تخلیقی عمل یا فن کے ذریعے سے حاصل کرتا ہے۔ گویا ادبی یا فنی تخلیق ادیب یا فن کار کے اپنے درد کا مداوا ہوتی ہے۔ اگر فرائڈ کا یہ نظریہ درست ہے تو سرشار صدیقی کی شاعری اس کے درد کا مداوا ہے۔ لیکن اس کا درد اس کے معاشرے سے بالکل بے تعلق خالص اس کی ذات کا مسلہ نہیں ہے اس کا درد ایک طرف اس کے اپنے جبلی تقاضوں کی عدم تسکین سے پیدا ہوتا ہے تو دوسری طرف اس کے اطراف پھیلی ہوئی ناانصافیاں اسے بے کل رکھتی ہیں۔ اس کی شاعری میں اس کے درد کے یہ دونوں پہلو نہایت دل نشیں انداز سے ابھر کر سامنے آتے ہیں۔۵

ایسے شعراء جو اپنے بدن کے تقاضوں سے ابھرنے والے جذبات سے بے نیاز صرف معاشرے میں پھیلی ہوئی ناانصافیوں کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں ان کی شاعری اکثر و بیشتر نعرے بازی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر ان ناانصافیوں کا دور سے تماشا کر رہا ہے۔ معاشرے میں پھیلی ہوئی ناانصافیاں اس کے اپنے درد کا حصہ نہیں ہے بلکہ وہ معاشرے کا وکیل بن کر ان ناانصافیوں کے خلاف اپنے دلائل پیش کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ رویہ تخلیقی فن کار کا رویہ کسی صورت میں بھی نہیں ہوسکتا۔ تخلیقی فن کار کے لیے ضروری ہے کہ وہ خارج سے مواد حاصل کر کے اسے اپنے لہو میں رچائے اور پھر متخیلہ کی مدد سے اس طرح چمکائے کہ وہ اس کی ذات سے پھوٹ کر از سر نو ایک نئی صورت سے خارج میں پھیل جائے۔۶

وہ ادب کے پرانے مریض ہیں اور اب یہ مرض زندگی کے ساتھ ہے۔ وہ ترقی پسند تحریک کے بنیادی ممبروں میں سے ہیں۔ اس تحریک سے انہوں نے اپنی وابستگی کو ادب کی جدید حسیت تک بڑے نفیس انداز میں برقرار رکھا ہے۔ اور نہ صرف برقرار رکھا ہے بلکہ آج بھی اس میدان میں نہایت متحرک ہیں۔ اور تخلیق کا عمل جاری ہے۔۷

سرشار صدیقی کی شاعری کا تجزیہ کرنے سے دو باتیں بڑی واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ سرشار اس نئی مملکت میں اپنی زندگی کے ماضی کا نعم البدل چاہتے ہیں جسے وہ چھوڑ کر آئے تھے۔ جس کا ملنا انہیں دشوار ہی نہیں ناممکن نظر آتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ وہ ایک ایسی زندگی چاہتے ہیں جس میں زندگی کی تمام خوشیاں دستیاب ہوں اجنبی ماحول میں سرشار خود کو تنہا ہی نہیں بلکہ مجبور محض بھی سمجھتے ہیں۔ ان میں یہ احساس اس لیے پیدا ہوا کہ پاکستان میں جو لوگ ملے اور جو ماحول ملا۔ اس سے سرشار کی ذہنی ہم آہنگی قائم نہ ہوسکی۔ ادبی حلقوں میں سرشار کو پزیرائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ شاعروں نے اپنے گھروں سے باہر دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔ کمروں کے دریچے بند کر لیے تھے۔ اور خلوت میں تصنع اور پرفریب فضا میں نفیس کے لیے شاعری کر رہے تھے۔ ان کے سامنے کوئی نصب العین نہیں تھا۔ شاعروں کو ان کی توقع سے زیادہ آسودگی زندگی میسر آ چکی تھی۔ جبکہ سرشار کی زندگی اس کے بالکل برعکس تھی۔ زندگی کی

ناآسودگی کے باوجود سرشار نے فکر ونظر کی بلا کی خاطر اپنے تاریک اور بوسیدہ کمرے کے دروازے کو دریچہ بنا دیا تھا۔حتیٰ کہ چھت بھی غائب کر دی تھی۔تا کہ اپنے اردگرد ہونے والی معمولی سی آہٹ یا کھلے آسمان پر ابھرنے والی روشنی کی پتلی سی لکیر بھی مشاہدے کی زد سے نہ بچ سکے۔یہی وجہ ہے کہ سرشار غم ذات کو غم کائنات بنانے میں دوسروں کے مقابلے میں بہت زیادہ کامیاب رہے ہیں۔پرآشوب دور میں احساس محرومی میں شدت پیدا ہو جاتی ہے۔۸؎

سرشار کی ابتدائی شاعری میں جب معاشرتی ناہمواریوں اور تہذیبی گراوٹ کا ذکر کیا گیا ہے انہیں زندگی کی زندہ حقیقت کے طور پر سرشار اپنی نظموں میں دوسرے موضوعات کے ساتھ ساتھ نہایت جچے تلے خیالات کے ساتھ پیش کرتے رہے ہیں۔ان کا زاویہ نگاہ معاشرتی خرابیوں کے ضمن میں ہر لحظہ تیز تر ہوتا گیا ہے۔ان برائیوں کے تعاقب میں ان کی نظر قومی اور ملی زبوں حالی پر بھی پڑتی ہے۔قومی اور ملی نظموں میں سیاسی بصیرت سے زیادہ سماجی شعور کی عکاسی پائی جاتی ہے۔ان میں اخلاقی گراوٹ اور تہذیبی ابتری کی ترجمانی کی گئی ہے۔ سرشار صدیقی استبدادی قوتوں کے چہرے سے نقاب اٹھاتے ہیں۔ظلم واستبداد کے خاتمے کا مژدہ سناتے ہیں۔مظلوموں اور ناداروں کو ان کے خلاف صف آراء کرتے ہیں۔ان کے حوصلے بڑھاتے ہیں۔۹؎

سرشار صدیقی نے ۱۹۴۴ء سے لے کر اب تک بدلتی ہوئی زندگی کا ساتھ جس ثابت قدمی کے ساتھ دیا ہے اس کی شاعری میں اس کی زندگی اس تاریخی پہلو کی تصویر کشی ہے۔اس نے ہمیشہ یہی سوچا کہ موجودہ زندگی کو کس طرح خوش گوار اور بہتر بنایا جا سکتا ہے۔کس طرح سنوارا اور نکھارا جا سکتا ہے اور یہ عزم اور یہ حوصلہ سرشار کے علاوہ کسی اور کے بس کی بات نہیں ہے۔اگر چہ اس کی شاعری، شاعری برائے شاعری کے مقبول زمانہ حسن سے محروم ہو جائے لیکن اس میں فکر اور جذبہ کو حیات افروز قوتیں ضرور موجود نہیں۔

سرشار صدیقی جس طرح حقائق حیات کو محسوس کرتے ہیں اسی طرح سچائی خلوص اور دیانت داری سے انہیں بیان کر دینے سے بھی نہیں چوکتا۔یہی وجہ ہے کہ اس کہ بعض نظموں میں بہت سے افراد کو سپاٹ پن نظر آئے گا۔لیکن اگر بغور اس نظم کا مطالعہ کریں گے تو انہیں احساس ہوگا کہ یہ سپاٹ پن اس نظم کا نہیں ہے۔بلکہ اس کھوکھلی زندگی کا ہے جس کی عکاسی کی گئی ہے۔وہ اپنے دور کی کسی بھی خرابی یا بدعنوانی کو برداشت نہیں کر سکتا۔اس کی نگاہ سے زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی اہم خرابیاں بھی نہیں بچتیں۔۱۰؎

سرشار صدیقی اپنی زندگی میں بہت سنگین کرب ناک تجربات سے گزرے ہیں۔اس لیے ان کے مزاج میں ایک طرح کا کھردرا پن اور کھرا پن شروع ہی سے ملتا ہے۔اس لیے حالات کو سازگاری اور زمانے کی ستم گری کے باوجود کبھی بھی احساس کمتری کا شکار نہیں ہوئے انہوں نے سچ کہا ہے کہ:

''میں نے جس حال میں ایک عمر بسر کی سرشار

ایک ہی دن کبھی اس طرح گزرے کوئی [11]

سرشار صدیقی کی کئی جہتیں ہیں۔مگر میں نے ان کی قومی شاعری کو خاص طور پر اپنا موضوع بنایا ہے۔

سرشار صدیقی کی نظمیں قومی اور بین الاقوامی تناظر میں ایک پختہ اور تربیت یافتہ شعور کی عکاسی کرتی ہیں۔

ان کی نظمیں اپنے اسلوب اور فکر دونوں کے اعتبار سے ایک اکائی ہیں۔انہوں نے اپنے اس نظریاتی وطن کے لیے عقیدت و محبت بھرے نغمے تخلیق کیے۔ان نغموں میں محض جذباتیت نہیں ہے بلکہ شعوری کیفیت کا اظہار ملتا ہے۔

قوم اور قومیت کے تعلق سے یوں تو متعدد نظریات پائے جاتے ہیں۔مگر دو نظریات بہت اہم ہیں۔پہلا بنیادی نظریہ وہ ہے جو مغرب کے ارباب وفکر و نظر نے تشکیل دیا ہو۔اہل مغرب نے خاندان، نسل اور قبیلوں کی اساس میں تھوڑی سی وسعت پیدا کر کے قومیت اور وطنیت کی صورت گری، جغرافیائی طور پر کی ہے۔[12]

دوسرا بنیادی قومی نظریہ آنحضرت ﷺ نے پیش فرمایا۔یہ نظریہ اس بات کی صراحت کرتا ہے کہ مسلمانوں کی قومیت ایک نظریاتی قومیت ہے۔جو مغربی نظریات کے برعکس نسل، رنگ، علاقہ، زبان اور جغرافیائی اساس پر نہیں بلکہ ایک عقیدے، ایک کتاب اور ایک کلمے کی بنیاد پر صورت پذیر ہوتی ہے۔اس نظریاتی قومیت کی گود میں ہر علاقے، ہر رنگ، ہر نسل اور ہر جغرافیائی ماحول کے افراد کے لیے سکون میسر ہے۔سرشار صدیقی نے ایک مسلمان ہونے کے ناتے سے اس اسلامی نظریے سے وابستگی کا اظہار کیا ہے اور اسی روشنی میں اپنی حب الوطنی کا تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔[13]

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری[14]

اس میں شک نہیں کہ اسلامی قومی نظریہ کے ماننے والے یہ بھی مانتے ہیں کہ:

''ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست''

یا اقبال کی زبان میں:

''مسلم ہیں ہم وطن ہیں سارا جہاں ہمارا''

کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔لیکن اس کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان جہاں جنم لیتا ہے یا جہاں بچپن سے جوانی اور جوانی سے بڑھاپے تک کی منزلوں کو طے کرتا ہے وہاں کی زمین کی سوندھی مہک، اس خطے کے ماحول کی خوشبو اور اس علاقے کے در و دیوار اور فصلوں کی اپنائیت اس کی رگ رگ میں لہو کی طرح دوڑ جاتی ہے۔[15]

قومی اور ملی نظموں میں سیاسی بصیرت سے زیادہ سماجی شعور کی عکاسی پائی جاتی ہے۔ان قومی منظومات، گیتوں،

ترانوں اورنغموں سے سرشار صدیقی کے قومی شعوراوران کے احساسات وجذبات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ان منظومات میں صرف احساس اور جذبے کا اظہار نہیں ملتا بلکہ فکر وشعور کی روشن شمعیں فروزاں ہیں۔ان نظموں میں سطحیت جذباتیت، وقتی ابال کے بجائے گہرا قومی شعوراور گہرائی بھی پائی جاتی ہے۔

''خزاں کی آخری شام'' سرشار صدیقی کا ایک شعری مجموعہ ہے۔جو قومی نظموں،ترانوں اورنغموں پر مشتمل ہے۔ یہ شعری مجموعہ ۱۹۸۸ء میں ایجوکیشنل پریس کراچی سے ۱۲صفحات پر شائع ہوا یہ ۶ عنوانات پر مشتمل ہے۔عکس، گونج، آہنگ، چراغاں دعائیے اور کونپل۔

عکس میں ۱۴ قومی نظمیں ہیں۔گونج میں ۶ قومی ترانے ہیں۔آہنگ میں ۱۰ قومی نغمے ہیں۔ چراغاں میں ۷ نظمیں ہیں۔جو جنگ ۷۱ء کے اسیروں کی واپسی کے موضوع کے حوالے سے ہیں۔دعائیے میں ۶ مناجاتیں شامل ہیں۔ جو سقوط ڈھاکہ کے بعد کی صورت حال کا شعری اظہار ہیں۔کونپل کے تحت ۶ ملی ترانے اور قومی نغمے ہیں۔ایک صفحہ پر منشور کے عنوان سے ہائیکو بھی لکھا ہے۔کتاب کے سرورق پر علامہ اقبال کا یہ مصرعہ تحریر ہے۔

''پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ''

خزاں کی آخری شام پر گفتگو کا آغاز اس کے دیباچے ''زمین کا پیوند'' سے کیا جاتا ہے۔ جو سرشار صدیقی کا لکھا ہوا ہے۔انہوں نے اس دیباچے میں اپنے خیالات کا اظہار جس طرح سچا اور بے باکانہ کیا ہے۔وہ ہم سب کے لیے غور طلب ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''پاکستان مجھے اپنے پیدائشی وطن سے زیادہ عزیز ہے کہ یہ میرا اختیاری وطن ہے۔اس سرزمین کو میں نے شعوری اطور پر بقید ہوش وحواس اپنی فانی زندگی کے لیے عارضی قیام گاہ اور مرنے کے بعد اپنی ابدی آرام گاہ کے طور پر منتخب کیا ہے''۔[۱۶]
>
> سرشار صدیقی نے اپنے دیباچے زمین کا پیوند میں قوم اور قومیت سے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس کی توثیق ان کی نظموں سے بھی ہوتی ہے۔ان نظموں سے وطن کی محبت کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی کے بہت سے گوشے بھی منور ہوگئے ہیں۔مثلاً جب انہوں نے اپنے وطن عزیز پاکستان کے صوبہ سندھ کی دھرتی پر اپنا پہلا قدم رکھا تھا۔اور ہجرت کو تکالیف کو برداشت کر کے اپنے وطن آئے تھے۔اس سرزمین نے انہیں تحفظ عطا کیا۔[۱۷]

ان کے دیباچے میں حقیقتوں کا سچا اور بے باکانہ اظہار ملتا ہے جو وطن کے بارے میں پرخلوص اظہار ہے۔ عقیدت اور محبت کا اظہار ہے۔ایسی سچی اور پرخلوص باتیں وہی کرسکتا ہے جس نے پاکستان بنتے ہوئے دیکھا ہو خود بھی آگ اور خون کے دریاؤں سے گزرا ہو اور احساسات وجذبات کا خون ہوتے ہوئے دیکھا ہو اور ہجرت کے مسائل سے دوچار ہو۔

سرشار صدیقی نے اس مجموعے کو مختلف عنوانات کے تحت تقسیم کیا ہے عکس کے عنوان سے جو قومی نظمیں وطنیت کے سلسلے میں لکھی گئی ہیں امیں نہ صرف وطن سے محبت بلکہ اپنی سرزمین سے والہانہ عقیدت ومحبت کے جو پھول نچھاور کیے ہیں یہ جذبہ خود اپنی جگہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔کتنے شعراء کرام ہیں جنہوں نے سرشار صدیقی کی طرح سوچا۔دراصل

لکھنے والوں کی اکثریت مصلحتوں یا شہرت کا شکار ہے۔اس کے برعکس حقیقتوں کا پرچارک اور سچائیوں کے سرستار سرشار صدیقی ہی ہیں۔

''خزاں کی آخری شام'' میں شاعر دنیا کی بے ثباتی کے بارے میں بتا رہے ہیں کہ وقت بدلتا رہتا ہے کبھی خوشی ہے کبھی غم۔ہمیں بہتری کی امید رکھنی چاہیے''نئی نسل'' کے بارے میں وہی لکھ سکتا ہے جس نے نیا وطن بنتے ہوئے دیکھا ہو۔اور اس اختیاری وطن کی خاطر جن گلیوں میں وہ کھیلا اور کودا اور شعور کی دہلیز پر قدم رکھا۔جن تعلیمی اداروں میں تہذیب کا پہلا حرف سیکھا جن شفیق بزرگوں کی آغوش تربیت میں پروان چڑھا وہ سب نشانیاں وہ سب محبتیں وہ سب جذبے قربان کردے اب نئی نسل کا کام ہے کہ وہ اس کو سنبھالے اور ترقی پر گامزن کردے۔

جیسا پاکستان ہمارے ذہنوں میں
ویسا پاکستان بنانا
میرے بعد کی آنے والی
نسل نو کا فریضہ ہے
پاکستان انہی کا ہے۔۱۸

''سندھ میری زمیں'' شاعر بتا رہے ہیں کہ جب میں پاکستان آیا تو سب سے پہلے سندھ کی زمین پر قدم رکھا۔ اس نے مجھے سہارا دیا۔اس نے عزت دی اور اپنی خواہش کا اظہار کررہے ہیں کہ میں اپنے وطن ہی میں مرنا چاہتا ہوں۔ بہت لمبا سفر طے کر چکا ہوں

تھک گیا ہوں
بس اب جی چاہتا ہے
کہ تیری گود میں
سر رکھ کے
تیری خاک اوڑھوں
اور گہری نیند سوجاؤں۔۱۹

''قرض ناخن'' میں فرماتے ہیں کہ روزی، رہائش، سب اس دھرتی سے ملا ہے۔میں نے اس دھرتی کے لیے دن رات محنت کی ہے۔

روزی، رزق، رہائش
سب کچھ
اپنی ہی محنت سے ملا ہے۔۲۰

''آپریشن کلین اپ''، ہمیں دعوت فکر دیتی ہے ہمیں آپس میں لڑنا نہیں چاہیے بلکہ دشمن تلاش کرنا چاہیے۔

''روح قائد'' میں قائداعظم کے مقصد کو بیان کیا ہے۔انہوں نے لوگوں کو اتحاد، تنظیم اور یقین محکم کا پیغام دیا تھا جس پر لوگ عمل نہیں کررہے ہیں۔

نہ اتحاد، نہ تنظیم ہے نہ ذوق یقین
ترے اصول وطن ہی میں بے وطن ہیں آج۔۲۱

''صبح صادق'' میں مصنف آزادی کی صبح کو دوسری صبحوں سے منفرد قرار دے رہے ہیں۔

یہ صبح وہ ہے
کہ جس نے کم حوصلہ دلوں کو
جسارت امتحاں بھی دی ہے
یہ صبح وہ ہے
کہ جس میں بانگ درا سے پہلے
مجاہدوں میں دیار شب میں
اذان بھی دی ہے۔۲۲

ہم اپنی سرزمین پر ہی آپس میں کتنے متحد ہیں یہ ہم سب جانتے ہیں۔لیکن سرشار صدیقی ہمیں متحد رکھنا چاہتے ہیں۔''زعفران کے کھیت'' میں یہ بتانے کی کوشش کررہے ہیں کہ سندھ میں رہتا ہوں مگر پنجاب، بلوچستان سرحد سب میرے وطن کا حصہ ہیں۔

یہ میرے صوبہ سرحد کے کوہسار بلند
یہ سنگلاخ چٹانیں، مرا بلوچستان
یہ سبزہ زاروں کا دریاؤں کا حسین پنجاب
یہ جگمگاتی ہوئی سندھ کی روپہلی ریت
یہ میری جنت ارضی، یہ زعفران کے کھیت۔۲۳

''ریت کی دیواریں'' ۶۵ء کی جنگ کے حوالے سے بیان کررہے ہیں کہ دشمن ہمارے ملک پر قبضہ کرنے آئے تھے۔مگر ہمارے جیالوں نے ان کو شکست دے دی۔

وہ آرہے تھے
ہمارے باغوں کو زرد کرنے
ہمارے کھیتوں کو گرد کرنے
ہمارے کھیتوں کو سرد کرنے
مگر زمانے نے یہ بھی دیکھا
کہ اس سے پہلے
کہ وہ جواں مرد وہ جیالے
ہمارے دریا عبور کرتے
ہمارے خوابوں کو چور کرتے

وہ خود ہی مسمار ہو چکے ہیں۔۲۴

''گونج'' کے عنوان میں قومی ترانے شامل ہیں۔اس سے وطن کی محبت اور قلبی لگاؤ کا پتہ چلتا ہے۔ یہ وطن جو شاعر کے خوابوں کی تعبیر اور حسین جذبوں کی تصویر ہے۔ وہ اس کی سلامتی خوش حالی اور ترقی کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہے۔ کیونکہ یہ سرزمین وطن ایک ایسا گوشہ عافیت ہے جو اس کے لیے ابر رحمت اور امن و مسرت کا گہوارا ہے جو اس کی خوشیوں کا مسکن ہے۔جس کے سائے میں وہ تازہ دم ہو کر نئی منزلوں کی تلاش میں سرگرم سفر ہو جاتا ہے۔

''جیالوں کے جھنڈا'' میں شاعر کہہ رہے ہیں کہ سبز ہلالی پرچم یوں ہی لہراتا رہے۔اس کے سائے تلے ہماری خوشیاں ہیں۔

سبز ہلالی پرچم اپنا سدا یونہی لہرائے
اس کے سائے میں زرہ زرہ گیت خوشی کے گائے۔۲۵

''جان آرزو'' میں شاعر کہہ رہے ہیں کہ میرا ملک میرے خواب کی تعبیر ہے میرا وطن خدا کی ایک نعمت اور معجزہ ہے۔

میرے خوابوں کی تعبیر میرا وطن
میرے جذبوں کی تصویر میرا وطن۔۲۶

''گوشہ عافیت'' میں شاعر نے اپنے وطن کو جنت کے ٹکڑے سے تشبیہ دی ہے۔اس کے گوشے گوشے میں خوشیاں ہیں۔اور اس کی خاطر اپنی جان قربان کر دیں گے۔

کون و مکان کی نعمت ہے یہ
سارے جہاں کی دولت ہے یہ
اس پر آنچ نہ آنے دیں گے خود مٹ جائیں گے
گوارا ہے۔۲۷

''نقش فردا'' میں یہ بتانا چاہ رہے ہیں کہ ہم ملک کو اتنا سنوارے گے جس طرح دلہن کو سنوارا جاتا ہے اور اس کو ایشیا میں نمایاں مقام دلائیں گے۔

تیرا ہر نقش ماضی ابھاریں گے ہم
تیرے فردا کو مل کر سنواریں گے ہم
سب کہیں گے تجھے ایشیا کی دلہن۔۲۸

اسی طرح آہنگ کے تحت جو قومی نغمے لکھے گئے وہ بھی سچے جذبوں کے عکاس ہیں۔''جیت کا گیت'' میں یہ باور کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہم کبھی ہمت نہیں ہاریں گے یہی ہماری جیت ہے۔

ہم نے ہمت کبھی نہ ہاری ، یہی ہماری جیت ہے
وادی وادی گونج رہے ہیں، امیدوں کے گیت۔۲۹

'نغمہ بہ لب' میں کہہ رہے ہیں کہ محبت کے ساتھ آگے بڑھو گے تو فتح نصیب ہوگی۔

فتح کے گیت گاتے چلو دوستو!
سیر پرچم اڑاتے چلو دوستو!!

دستِ صبا، سفید ہاتھی، محنت کش، کسان، ہمیں دعوتِ فکر دیتی ہیں۔ ہمارا دین اسلام پیار و محبت کا درس دے رہا ہے۔ محنت کش خون پسینہ ایک کر کے وطن کی خدمت کر رہے ہیں۔ ان محنت کشوں کی وجہ سے ہمارے ملک میں خوشیاں ہیں۔

ان کھیتوں سے کھلیانوں تک
خوشیوں کے سارے نشانوں تک
ابن ہر آنگن میں میلے ہیں
اب ہر گھر میں دیوالے ہے
یہ رت کیسی متوالی ہے۔۳۱

مرکزِ یقین میں کہہ رہے ہیں کہ مسلمانوں دنیا کے کسی کونے میں ہوں سب خدا کے ماننے والے ہیں۔ اور سب کا ایک ہی کلمہ ہے۔

ایشیا افریقہ اور یورپ سب گلزار ہمارے
کوئی پھول عجم کا اس میں کوئی پھول عرب کا
اک جیسی خوشبو ہے سب کا ایک ہی رنگ ہے سب کا۔۳۲

''چراغاں'' میں ۱۷ء کے اسیروں کی واپسی سے متعلق جو نظمیں ہیں ان میں مراجعت اور سینہ چاکاں وطن بھرپور نظمیں ہیں جن میں قومی جذبے کی صداقت کا خلوص ملتا ہے۔ شاعر نے ۱۷ء کے اسیروں کے بارے میں بتایا ہے کہ انہوں نے امید کی کرن جگائے رکھی وہی امید ان کو وہاں سے باہر لائی تھی۔ قید کی کیفیت سے آزادی تک کا سفر بیان کیا ہے۔ اور خدا کا شکر ادا کیا ہے۔

عہد وفا کے اس پرچم کو
آؤ سرفراز کریں
بچھڑے ہوؤں سے ملنے کا یوں جشن منائیں
سجدہ شکر میں
دل کی جبیں جبیں تک جھک جائیں
بند کریں ماضی کے روزن
فردا کے دربار کریں
عہد نیا آغاز کریں۔۳۳

حسابِ سود و زیاں میں قیدیوں کے ماحول کی منظر کشی کی ہے جس طرح مشکل وقت گزار کر شادمانی کے لمحے حاصل کیے ہیں۔

دلوں کو شادمانی کا یہ لمحہ

بہت کچھ کھو کے حاصل ہوسکا ہے

'سینہ چاکان وطن' میں قید کے بعد وطن واپس آنے کہ بہت خوشی ہورہی ہے۔جس کا اظہار شاعر نے اپنی نظم میں اس طرح کیا ہے۔

دست دعا کے سائے سائے
بچھڑے ہوئے گھر واپس آئے
وقت نے لی انگڑائی
ملنے کی رُت آئی۔۳۵

'سلام غائبانہ' میں سپاہیوں کو سلام پیش کیا ہے۔

جو مقتلوں سے کبھی لوٹ کر نہ آئیں گے
انہیں سلام ہو ان کی شہادتوں کو سلام۔۳۶

دعائیے کے عنوان میں شاعر کہہ رہے ہیں کہ ملک دونیم ہوا۔مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بنا اور مغربی پاکستان ماتم کدہ بن گیا۔بے شمار جیالے اسیر جنگ قرار پائے۔شاعر دعا کررہے ہیں کہ ہماری خطاؤں کو معاف کردیں اور نبی کے طفیل ہم پر رحم فرما۔

خطاؤں کو بخشش کا پیغام دے
ہمیں اپنی رحمت کا انعام دے۔۳۷

شاعر کہہ رہے ہیں کہ ہماری مشکلیں آسان کردے اور ہم میں اتفاق پیدا کردے۔

تری رحمت کی کوئی حد نہیں ہے
ہماری مشکلیں آسان کردے۔۳۸

شاعر دعا کررہے ہیں کہ ہم میں بھائی چارہ پیدا کردے اور ہم ایک پرچم تلے رہیں اور اسی وطن میں دفن ہوں۔

یہ خاک وطن ہی تو پرچم ہے اپنا
یہ خاک وطن ہی ہمارا کفن ہو۔۳۹

کونپل کے عنوان میں 'جاگا پاکستان' میں شاعر نے قوم کی بے داری کو بیان کیا ہے۔

بچہ بچہ جاگ رہا ہے
چپہ چپہ جاگ رہا ہے
بیداری قوم و وطن پر
دنیا ہے حیران، جاگا پاکستان۔۴۰

''کتنا اچھا وطن'' میں شاعر کہنا چاہ رہے ہیں کہ ہمارا وطن بہت اچھا ہے۔ہم ابھی بچے ہیں ۔ جب بڑے ہوجائیں گے اس کو خاطر جان قربان کردیں گے۔

ہم ہیں کم سن تو کیا وقت اگر آئے گا

ایک اک اس پہ قربان ہوجائے گا۔۴۱؎

'قومی پھول' میں شاعر کہہ رہے ہیں کہ ہمارا قومی پھول چنبیلی ہے۔جس طرح اس کی خوشبو ہر طرف پھیلتی ہے ہمارے وطن کی خوشبواس طرح پھیلے گی۔سرشارصدیقی کی یہ قومی شاعری فطری شاعری کوساتھ لے کر چلتی ہے۔

دنیا کو مہکانے والی
خوشبو اس کی سہیلی ہے
اپنا ہی پھول چنبیلی ہے۔۴۲؎

'وطن کے موسم' میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہمارے وطن میں ہر طرح کا موسم ہے۔

آؤ کریں موسم کی بات
سردی، گرمی اور برسات۔۴۳؎

زیرنظر مجموعہ میں لفظیات کوتراش خراش اورتراکیب میں ہنرمندی تو دکھائی دیتی ہے مگر بعض نظموں میں تازہ کاری کا تخلیقی ذائقہ جذیدحسیت کے ساتھ کماحقہ موجودنہیں۔خاص طور پر اس کمی کا احساس چراغاں اور دعائیہ کے تحت لکھی گئی نظموں میں زیادہ ہوتا ہے۔ان میں وقتی جدباتیت کارجحان بہت نمایاں ہے۔جس کے سبب ان کوتخلیقات میں نہ فکری گہرائی ہے اور نہ رس اور حسن اور نہ ہی برجستگی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے۔جوقدر دوام اور ادبی شان کے تخلیقی منطقے پر موجزن ہوسکیں۔

ادب وشعر چاہے کتنے ہی اعلیٰ اور کتنے ہی افادی جذبے کے تحت تخلیق کیا جاتا اسے صوری ہیتی اور اسلوبیاتی اعتبار سے جمالیاتی خصوصیت کا حامل ہونا چاہیے۔اعلی مقصد اعلی ترین نادرہ جوئی اور بلندترین تخلیقی عناصر کا متقاضی ہے۔تخلیق تو وہ ہے جولطافت اور مقصدیت سے ہم آہنگ ہوکر اظہاریت کے پیکر میں اس جمالیاتی شان کے ساتھ ڈھل جائے کہ قاری مسرت خیز حیرانی محسوس کرے۔اور غیرمحسوس طریقے پر تخلیق کے بطن میں پوشیدہ مقاصد تک پہنچ جائے۔اگر کسی تخلیق کار کی کوشش ان خصوصیت سے محروم ہے تو اسے نہ دائمی زندگی مل ے گی اور نہ عام پسندیدگی اس کے حصے میں آئے گی۔

الغرض سرشارصدیقی کی قومی شاعری کا مطالعہ کرنے سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سرشارصدیقی کواپنے وطن سے بے پناہ محبت ہے۔ان کواگر ایک سچااور مخلص پاکستانی کہا جائے تو بے جانہ ہوگا۔حب الوطنی کا جذبہ ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔

آج قومی یکجہتی اور ملکی وحدت بحران کا شکار ہے۔اور ہر محبّ وطن پاکستانی کے لیے تشویش ناک ہے۔قومی تقاضوں کو پورا کرنے میں یہ کتاب مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔۴۵؎

حواشی

۱۔ پروفیسر اشتیاق طالب سندھ زمین بھی آسمان بھی مشمولہ شفاف آدمی، حرافاؤنڈیشن، کراچی، ۲۰۰۸ء ص۴۹

۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری ذکروصال، مشمولہ 'شفاف آدمی' حرافاؤنڈیشن، کراچی ۲۰۸ء، ص۹۶

۳۔ پروفیسر ڈاکٹر سید سعید احمد 'جواماں ملی تو کہاں ملی' مشمولہ 'شفاف آدمی' حرافاؤنڈیشن، کراچی، ۲۰۰۸ء، ص۸۴

۴۔ انجم اعظمی 'میرا ہم عصر شاعر' ،مشمولہ 'شفاف آدمی' حرافا وَنڈیشن، کراچی ۲۰۰۸ء، ص ۱۰۹

۵۔ احمد ہمدانی جبلتوں کی تنظیم نو کا شاعر، مشمولہ 'شفاف آدمی' حرافا وَنڈیشن، کراچی ۲۰۰۸ء، ص ۱۴۴

۶۔ احمد ہمدانی جبلتوں کی تنظیم نو کا شاعر، مشمولہ 'شفاف آدمی' حرافا وَنڈیشن، کراچی ۲۰۰۸ء، ص ۱۴۵

۷۔ تابش دہلوی من تو شدم مشمولہ 'شفاف آدمی' حرافا وَنڈیشن، کراچی ۲۰۰۸ء، ص ۴۹

۸۔ پروفیسر مظفر ملاٹھوی سرشار صدیقی، مشمولہ 'شفاف آدمی' حرافا وَنڈیشن، کراچی ۲۰۰۸ء، ص ۱۸۱

۹۔ پروفیسر مظفر ملاٹھوی سرشار صدیقی، مشمولہ 'شفاف آدمی' حرافا وَنڈیشن، کراچی ۲۰۰۸ء، ص ۱۸۴

۱۰۔ پروفیسر اسحاق اطہر صدیقی 'یہ درد متاع عام نہیں' ذکر وصال، مشمولہ 'شفاف آدمی' حرافا وَنڈیشن، کراچی ۲۰۰۸ء، ص ۲۱۵

۱۱۔ شبیر احمد انصاری شفاف آدمی، صبح کرنا شام کا حرافا وَنڈیشن، کراچی ۲۰۰۸ء، ص ۱۱

۱۲۔ شفیق احمد شفیق 'خزاں کی آخری شام' مشمولہ 'شفاف آدمی' حرافا وَنڈیشن، کراچی ۲۰۰۸ء، ص ۲۸۶

۱۳۔ شفیق احمد شفیق 'خزاں کی آخری شام' مشمولہ 'شفاف آدمی' حرافا وَنڈیشن، کراچی ۲۰۰۸ء، ص ۲۸۷

۱۴۔ شفیق احمد شفیق 'خزاں کی آخری شام' مشمولہ 'شفاف آدمی' حرافا وَنڈیشن، کراچی ۲۰۰۸ء، ص ۲۸۷

۱۵۔ شفیق احمد شفیق 'خزاں کی آخری شام' مشمولہ 'شفاف آدمی' حرافا وَنڈیشن، کراچی ۲۰۰۸ء، ص ۲۸۸

۱۶۔ سرشار صدیقی 'خزاں کی آخری شام' ایجوکیشنل پریس، کراچی ۱۹۸۸ء، ص ۹

۱۷۔ شفیق احمد شفیق 'خزاں کی آخری شام' مشمولہ 'شفاف آدمی' حرافا وَنڈیشن، کراچی ۲۰۰۸ء، ص ۲۸۹

۱۸۔ سرشار صدیقی 'خزاں کی آخری شام' ایجوکیشنل پریس، کراچی ۱۹۸۸ء، ص ۱۸

۱۹۔ سرشار صدیقی 'خزاں کی آخری شام' ایجوکیشنل پریس، کراچی ۱۹۸۸ء، ص ۲۱

۲۰۔ سرشار صدیقی 'خزاں کی آخری شام' ایجوکیشنل پریس، کراچی ۱۹۸۸ء، ص ۲۴

۲۱۔ سرشار صدیقی 'خزاں کی آخری شام' ایجوکیشنل پریس، کراچی ۱۹۸۸ء، ص ۲۸

۲۲۔ سرشار صدیقی 'خزاں کی آخری شام' ایجوکیشنل پریس، کراچی ۱۹۸۸ء، ص ۳۴

۲۳۔ سرشار صدیقی ’خزاں کی آخری شام‘ ایجوکیشنل پریس، کراچی ۱۹۸۸ء، ص ۳۹

۲۴۔ سرشار صدیقی ’خزاں کی آخری شام‘ ایجوکیشنل پریس، کراچی ۱۹۸۸ء، ص ۴۵

۲۵۔ سرشار صدیقی ’خزاں کی آخری شام‘ ایجوکیشنل پریس، کراچی ۱۹۸۸ء، ص ۵۳

۲۶۔ سرشار صدیقی ’خزاں کی آخری شام‘ ایجوکیشنل پریس، کراچی ۱۹۸۸ء، ص ۵۵

۲۷۔ سرشار صدیقی ’خزاں کی آخری شام‘ ایجوکیشنل پریس، کراچی ۱۹۸۸ء، ص ۶۰

۲۸۔ سرشار صدیقی ’خزاں کی آخری شام‘ ایجوکیشنل پریس، کراچی ۱۹۸۸ء، ص ۶۲

۲۹۔ سرشار صدیقی ’خزاں کی آخری شام‘ ایجوکیشنل پریس، کراچی ۱۹۸۸ء، ص ۶۷

۳۰۔ سرشار صدیقی ’خزاں کی آخری شام‘ ایجوکیشنل پریس، کراچی ۱۹۸۸ء، ص ۶۸

۳۱۔ سرشار صدیقی ’خزاں کی آخری شام‘ ایجوکیشنل پریس، کراچی ۱۹۸۸ء، ص ۸۰

۳۲۔ سرشار صدیقی ’خزاں کی آخری شام‘ ایجوکیشنل پریس، کراچی ۱۹۸۸ء، ص ۸۱

۳۳۔ سرشار صدیقی ’خزاں کی آخری شام‘ ایجوکیشنل پریس، کراچی ۱۹۸۸ء، ص ۸۹

۳۴۔ سرشار صدیقی ’خزاں کی آخری شام‘ ایجوکیشنل پریس، کراچی ۱۹۸۸ء، ص ۹۰

۳۵۔ سرشار صدیقی ’خزاں کی آخری شام‘ ایجوکیشنل پریس، کراچی ۱۹۸۸ء، ص ۹۶

۳۶۔ سرشار صدیقی ’خزاں کی آخری شام‘ ایجوکیشنل پریس، کراچی ۱۹۸۸ء، ص ۱۰۳

۳۷۔ سرشار صدیقی ’خزاں کی آخری شام‘ ایجوکیشنل پریس، کراچی ۱۹۸۸ء، ص ۱۰۴

۳۸۔ سرشار صدیقی ’خزاں کی آخری شام‘ ایجوکیشنل پریس، کراچی ۱۹۸۸ء، ص ۱۱۰

۳۹۔ سرشار صدیقی ’خزاں کی آخری شام‘ ایجوکیشنل پریس، کراچی ۱۹۸۸ء، ص ۱۱۱

۴۰۔ سرشار صدیقی ’خزاں کی آخری شام‘ ایجوکیشنل پریس، کراچی ۱۹۸۸ء، ص ۱۱۶

۴۱۔ سرشار صدیقی ’خزاں کی آخری شام‘ ایجوکیشنل پریس، کراچی ۱۹۸۸ء، ص ۱۱۷

۴۲۔ سرشار صدیقی ’خزاں کی آخری شام‘ ایجوکیشنل پریس، کراچی ۱۹۸۸ء، ص ۱۱۶

۴۳۔ شفیق احمد شفیق ’خزاں کی آخری شام‘ ایجوکیشنل پریس، کراچی ۱۹۸۸ء، ص ۱۱۷

۴۴۔ شفیق احمد شفیق ’خزاں کی آخری شام‘ مشمولہ شفاف آدمی، حرافا وَنڈیشن، کراچی ۲۰۰۸ء، ص ۲۹۱

۴۵۔ شفیق احمد شفیق ’خزاں کی آخری شام‘ مشمولہ شفاف آدمی، حرافا وَنڈیشن، کراچی ۲۰۰۸ء، ص ۲۹۱